عمار خان ناصر صاحب اور منکرینِ "حدیث" کا موقف

کاشف علی خان شیر وانی

علمی تنقید ایک بھاری صنف ہے، اور عمدہ علمی تنقید استدلال کے اسلوب میں ایک خاص مشکل پر غلبہ پائے بغیر وجود میں نہیں آتی۔ وہ یہ کہ مخاطب کے مفروضات کی معرفت کے ساتھ تنقید کی جائے، اور مخاطب کے مفروضات کو غیر شعوری یا شعوری طور پر قبول کرنے سے احتراز کرتے ہوئے، تنقید کی جائے۔ مستشرقین اور مسیحی مشنریوں کے جواب دیتے وقت بہت سے لوگ اس مشکل پر قابو نہ پا سکے۔ متجددین اور معذرت خواہ ہندو اور مسلمانوں نے اپنے تئیں ان کے اعتراضات کے جوابات دینے کی کوشش کی، لیکن اس عمل میں ان کے مفروضات، ان کی منطق اور ان کے مبادیات کو تسلیم کر لیا۔ یہ معاملہ بالخصوص وہاں ہوا جہاں تنقید و تبادلہ ان سے تھا جو مغربی تہذیب و استعمار کے کاندھوں پر سوار ہو کر آئے تھے، اور قوت ان کے ساتھ تھی۔ اس علمی غلطی کے مفاسد دیر پا ثابت ہوئے۔ اس کمزوری کے مظاہر سر سید احمد خاں، مرزا غلام احمد، مولوی چراغ علی، حمید الدین فراہی، شبلی نعمانی، غلام احمد پرویز، جاوید غامدی، ور ان کے پیروکاروں کے کام میں دیکھے جاسکتے ہیں۔ اس دام سے بچ کر نکلنے والوں میں سب سے عمدہ مثال مولانا رحمت اللہ کیرانویؒ کی ہے، جنھوں نے مسیحی مشنریوں سے برسوں بحث کی، اور بالآخر غایت درجے میں شکست دی، نہ معذرت خواہی اختیار کی، نہ مشنریوں اور مستشرقین کے مفروضوں کو قبول کیا۔ اور یوں، اس علمی مشکل پر جس طرح انہوں نے قابو پایا، وہ قابلِ تقلید ہے۔

جب عمار خان ناصر صاحب نے منکرینِ حدیث پر تنقید لکھنے کی کوشش کی، تو بہ ظاہر یہی مشکل آڑے آ گئی، اور اُن سے سر نہ ہو سکی (فیس بک، مورخہ ۲۸/اگست، ۲۰۲۰ء)۔

پہلی بات تو یہ ہے کہ جس تحریر کو تنقید کا نشانہ بنانے کے لیے منتخب کیا ہے اس کے مصنف کا نام اور کتاب کا عنوان وغیرہ دینے کی ضرورت نہیں سمجھی۔ کسی ایک اقتباس پر تنقید کی جا سکتی ہے، لیکن مأخذ کی نشاندہی ضروری ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جس پر تنقید کی جارہی ہے اس کا حق ہے کہ ہم عمار صاحب کی تنقید کے مقابل اس کی پوری فکر رکھ کر دیکھ سکیں کہ تنقید سیاق و سباق اور مجموعی فکر کا لحاظ کر کے لکھی گئی ہے یا نہیں۔ قارئین کے لیے ممکن ہونا چاہیے کہ دیکھ سکیں کہ عمار صاحب نے کسی کے خیالات کا جو خلاصہ پیش کیا گیا ہے، اور اس کی جو غلطی بتائی ہے، اس میں خود عمار صاحب کا فہم درست بھی ہے یا نہیں۔ بعض اوقات مأخذ کو مخفی رکھنے کے کچھ دوسرے، زیادہ قابلِ مذمت، محرکات بھی ہوا کرتے ہیں۔ ان کی جانب بھی آئیں گے، لیکن پہلے اس تنقید کی حرکیات کو دیکھیے۔

پہلے ہی جملے سے معلوم ہو جاتا ہے کہ تحریر "انکارِ حدیث" کا تجزیہ کرنے کے لیے نہیں، بلکہ "انکارِ سنت" کا تجزیہ کرنے کے لیے لکھی ہے۔ نفسِ مسئلہ کے بیان میں یہ تصرف اہم ہے۔ معلوم ہے کہ بعض مبتدع گروہوں کے نزدیک ان دونوں میں فرق ہے، اور ان کے نزدیک سنت کا انکار تو باعث تشویش ہے، لیکن حدیث کے انکار کا معاملہ کوئی اہمیت نہیں رکھتا۔ عمار صاحب کے استاد جاوید غامدی بھی انہی میں سے ہیں۔ دیکھنے کی ضرورت ہے کہ الفاظ میں اس تصرف کی وجہ یہی تو نہیں ہے؟ اور اس کا بالآخر مقصد یہ تو نہیں ہے کہ "بُرے منکرینِ حدیث" کی مذمت کی جائے لیکن "اپنے" منکرینِ حدیث کی علمی و دینی غلطی پر پردہ ڈال دیا جائے؟

دوسری بات یہ ہے کہ عمار ناصر صاحب نے جامعیت کے انداز میں بتایا ہے کہ منکرین "سنت" کا موقف تین مغالطوں پر مبنی ہے۔ ظن کے معانی و مفہوم میں خلطِ مبحث، "سنت" اور "اخبارِ آحاد" میں فرق کا لحاظ نہ کرنا، اور وضعِ حدیث پر ضرورت سے زیادہ زور دینا۔ ان میں دوسرا مغالطہ بھرتی کا ہے، اس معنی میں کہ سنت اور حدیث کا مبینہ فرق خود انکارِ حدیث کی طرف لے جاتا ہے، جیسا کہ اسلم جیراجپوری اور جاوید غامدی جیسے منکرینِ حدیث کے ہاں ہُوا ہے۔

تیسری بات، اور جو مرکزی اہمیت رکھتی ہے، وہ یہ ہے کہ عمار صاحب نے کسی نامعلوم مصنف کا جو اقتباس نقل کیا ہے اس کے پہلے جملے میں منکرینِ حدیث کا بنیادی مفروضہ بیان ہو گیا تھا:

"دین وہی ہے جو یقینی ہو، ظنی یا قیاسی نہ ہو" (استغفر اللہ)۔

چونکہ عمار صاحب کے بقول منکرینِ سنت کے "بنیادی استدلالی مغالطے" وہی تین ہیں جو انہوں نے لکھے ہیں، معلوم ہوا کہ وہ اس مقدمے کو بالکل بھی اہم نہیں سمجھتے، جس سے معلوم ہوا کہ یا عمار صاحب اس بنیادی مفروضے کو خاموشی سے قبول کر رہے ہیں، یا کم از کم اسے "بنیادی" غلطی تسلیم نہیں کرتے۔ دونوں صورتوں میں ان کا موقف درست نہیں ہے۔ منکرینِ حدیث کے استدلال میں اصل بات یہی ہے، کہ اگر مان لیا جائے کہ فقط یقینی شے ہی دین ہوتی ہے، تو اخبارِ آحاد یک جنبش قلم ظنی ہونے کی بنا پر دین کے دائرے سے خارج ہو جاتی ہیں، اور منکرین حدیث کا مقصد حاصل ہو جاتا ہے۔ اس اہم نکتے کو نظر انداز کر کے، اِدھر اُدھر کے، نسبتاً کم اہم تین عدد نکات کو منکرین حدیث کی "بنیادی" غلطی بتانا، علمی اعتبار سے بھی غلط ہے، اور دینی نتائج کے اعتبار سے بھی مضر ہے۔ اور اگر یہ کام جانتے بوجھتے کیا جائے تو سخت بددیانتی بھی ہے۔

چوتھی بات: اہل سنت والجماعت کے نزدیک دین ظنی ذرائع سے ثابت ہوتا ہے۔ اخبارِ آحاد ظنی ہونے کے باوجود دین میں واجب العمل ہیں۔ یہ جمہور اُمت کا موقف ہے۔ احناف کے اصولیین نے تصریح کی ہے، اور مذاہبِ ثلاثہ بھی اس پر متفق ہیں۔ البتہ ایک گروہ کے نزدیک اخبار آحاد کی اہمیت اس سے بھی زیادہ ہے، کہ ان میں سے بعض کے نزدیک اخبارِ آحاد موجبِ علم بھی ہوتی ہیں۔ منکرینِ حدیث کا مابہ الامتیاز موقف یہی ہے کہ اخبارِ آحاد سے دین ثابت نہیں ہوتا، نہ علم میں نہ عمل میں۔ یہ انحراف اس قدر قبیح ہے کہ بقول امین احسن اصلاحی، غلام احمد پرویز کی تکفیر پر مکاتب فکر میں جو اتفاق ہے، ویسا اتفاق بس قادیانیوں کی تکفیر پر ہی ہوا تھا (اصلاحی، تفہیم دین، صفحات: ۱۷۳ تا ۱۷۴)۔

پانچویں بات ایک وضاحت ہے۔ اہل سنت والجماعت کے نزدیک روایات و اخبار میں، ثبوت اور دلالت کے اعتبار سے فرقِ مراتب ہے۔ یقین، ظن، اور شک کی اصطلاحات کی فنی تعریفات موجود ہیں۔ مثلاً، یقینی ذرائع ظنی ذرائع پر فوقیت رکھتے ہیں، اور اختلاف کی صورت میں ترجیح کا اصول اسی قاعدے پر مبنی ہے۔ لیکن جو امر سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف ظنی نسبت پا جائے، اس کو بھی مقبول سمجھا جاتا ہے، اور دین میں اس سے استدلال و استفادہ جائز ہے، اور وہ واجب العمل ہے۔

اس کے مقابلے میں منکرین حدیث کا اصل استدلال یہ ہے کہ دین فقط یقینی ذرائع سے ثابت ہوتا ہے۔ منکرین حدیث کا یہ قول بے بنیاد ہے، اور ایک بلاثبوت دعویٰ ہے۔ قرآن مجید اور احادیث مبارکہ میں کہیں یہ اصول بیان نہیں ہوا۔ لہٰذا اس خود ساختہ اصول کی بنا پر دین کا حلیہ بگاڑنے کی شناعت

محتاجِ بیان نہیں۔ عمار صاحب کی تحریر سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ منکرینِ حدیث کی اس بنیادی غلطی کو دانستہ یا نادانستہ نظر انداز کر رہے ہیں۔ یعنی یا تو اس کو سمجھ نہیں پائے، یا جانتے بوجھتے پردہ ڈال رہے ہیں، واللہ اعلم۔ اس میں ہم کوئی فیصلہ نہیں کر رہے، اس کی وضاحت کرنے کا حق اُنہیں کو ہے۔ لیکن ہم امکانات کو قارئین کے سامنے رکھ رہے ہیں۔ جیسا ہم نے عرض کیا اس تذبذب اور گومگو حال کی وجہ غامدی صاحب کا انکارِ حدیث ہے جس کے لیے انہوں نے بعینہ اسی استدلال کو بنیاد بنایا تھا، یعنی یہ کہ اخبارِ آحاد یقینی نہیں ہوتیں لہٰذا حدیث سے دین میں کچھ بھی ثابت نہیں ہوتا (میزان، سنہ ۲۰۰۸ء، صفحہ: ۱۵)۔ استغفر اللہ۔ جب اس پر تنقید ہوئی تو غلام احمد پرویز کے دوسرے قول کو اختیار کیا، کہ احادیث لکھوائی نہیں گئی تھیں (میزان، سنہ ۲۰۱۸ء: ۱۵)۔ اس عذر کا مآل بھی وہی ہے، کہ جب لکھوائی نہیں گئیں تو تاریخی استناد میں کمزور ہیں، اور دین میں کسی عمل کو واجب نہیں کرتیں۔ اول تو یہ استدلال ہی بے بنیاد ہے، تاریخی اعتبار سے بھی اور دینی اعتبار سے بھی۔ بالخصوص دینی اعتبار سے، کہ یہ دعویٰ ان کے خود ساختہ مزعومات پر کھڑا ہے، نصوص پر نہیں۔ قرآن مجید میں کہاں لکھا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے فقط وہی اقوال، اعمال، اور احکام، قابل اتّباع ہوتے ہیں جنہیں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے تحریر کی صورت میں اُمت کے حوالے کیا ہو؟ یہ دعویٰ کرتے ہوئے منکرینِ حدیث یہ بھی نظر انداز کر گئے کہ اللہ کی مُنزل کتب میں سے ایک انجیل بھی ہے، جس کے بارے میں معلوم ہے کہ وہ حضرت مسیح بن مریم علیہما السلام نے ہر گز نہیں لکھوائی، نہ اس کی حفاظت کا اہتمام ہی فرمایا، لیکن اس کے باوجود ان کے پیروکار اس پر عمل کرنے کے مکلف تھے۔

خلاصہ یہ ہے کہ عمار ناصر صاحب منکرینِ حدیث (نہ کہ فقط منکرینِ "سنت"!) پر ضرور تنقید فرمائیں، کہ منکرینِ حدیث کی گمراہی کے استیصال کی سخت ضرورت ہے، لیکن شرط یہ ہے کہ استدلال میں نہ ایسا جھول ہو جس سے منکرین حدیث کو اُلٹا تقویت پہنچے، نہ ہاتھ کی ایسی صفائی ہو جس سے اپنی آستین میں چھپے منکرینِ حدیث کی گمراہی لوگوں کی نگاہوں سے اوجھل ہو جائے!